Date of Publication : 23-04-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 24-25 April. 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 May 2014
Issue: 17, Vol.:73

یکم تا ۷ رمئی ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۱۷، جلد نمبر: ۷۳

اس مضمون میں علامہ اقبالؔ کی شاعری کی ادبی خوبیوں یا ادبی مرتبے پر بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ ان کے افکار و نظریات پر ایک خاص زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ زاویہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے بہت اہم ہوسکتا ہے اگر وہ اس آئینے میں اپنے خد و خال کو دیکھنے کی کوشش کریں۔ اسی مقصد کے پیش نظر یہ مضمون یہاں شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

حضرت علامہ اقبال نے اپنے خطبات 'تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' میں تصور تقدیر کو اس طرح موضوع نہیں بنایا کہ کامل خطبہ اس کے لیے وقف کردیا ہو۔ تاہم دوسرے، تیسرے اور چوتھے خطبے میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ ویسے تقدیر کے باب میں ان کے نظریے کی تاثیر (Impact) تو تقریباً ہر میں جلوہ گر ہے اور وہ اس لیے کہ اگر حضرت علامہ تقدیر کے اس تصور کے

اس عندیے کا اظہار کیا ہے:

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

پہلی قسط

علامہ اقبالؔ کا تصورِ تقدیر

پروفیسر محمد منور

منکر ہوتے جو انھوں نے خطبات میں پیش کیا ہے تو اُن کا سارا فلسفہ بے مدار ہوجاتا۔ ان کے فلسفے کی روح خودی ہے اور اگر تقدیر کا وہ مفہوم قبول کرلیا جائے جسے عام مروج معنوں میں 'قسمت' کہا جاتا ہے تو اثبات خودی یا تعمیر خودی کا مسئلہ ہی باقی نہیں رہتا اور نفی خودی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس ضمن میں حضرت علامہ کے اپنے کلمات یہ ہیں:

"قرآن مجید نے بارہا تقدیر کی طرف اشارہ کیا ہے لہٰذا ہمیں تقدیر کے مسئلے پر بھی غور کرلینا چاہیے، بالخصوص اس لیے کہ زوال مغرب میں اشپنگلر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلام خودی کی نفی کا خواہش مند ہے۔"

حضرت علامہ کی نظروں میں یہ کائنات آدم کی کارگاہ ہے جس میں اُسے اپنے جملہ امکانات اور قوتیں کو بروئے کار لانا ہے۔ انھوں نے اپنی نظم 'روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے' میں بالفاظ ذیل

ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ آدم کی یہ کارگہ، یہ دنیا، یہ کائنات خود اپنی جگہ تا حال مکمل نہیں، یہ نہ مسدود ہے نہ منتقل:

کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ان کے نزدیک یہ جہاں، جہان نامی ہے چناں چہ ہر لحظہ بڑھتے رہنے والے جہان کی اس کیفیت پر قرآن کے حوالے سے استدلال کرتے ہیں "کل یوم ھو فی شان" (ہر روز خدا کسی نئے رنگ، حال، روپ اور دھندے میں ہوتا ہے) "یزید فی الخلق ما یشاء" (خلق میں حسب منشا وہ اضافہ کرتا رہتا ہے)۔

حضرت علامہ دوسرے خطبے میں فرماتے ہیں اور اس اقتباس کے مطالعے سے ان کی فکر کی نہج کا پتا بخوبی چل جاتا ہے:

"ہم اسے (کائنات کو) موجود کہتے ہیں تو ان معنوں میں کہ وہ ایک غیر متعین امکان ہے چناں چہ بطور ایک 'نامی کل' زمانے کا یہی تصور ہے جس کو قرآن پاک نے تقدیر

سے تعبیر کیا ہے لیکن جس کو نہ اسلامی دنیا ٹھیک ٹھیک سمجھ سکی نہ غیر اسلامی دنیا۔ دراصل تقدیر عبارت ہے اس زمانے سے جس کا انکشاف ابھی باقی ہے۔"

بہ زبان شعر انھوں نے یہی بات اس طرح بیان کی:

سلسلۂ روز و شب، تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

یہ کائنات جسے حضرت علامہ 'نامی کل' کہتے ہیں، ایک غیر متعین امکان اس لیے ہے کہ بڑھنے اور تکمیل کی راہیں طے کرنے کی آزادی ہے۔ اسے یکبارگی کامل و سالم و جامع بناکر نہیں بھیج دیا گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر زمانہ تخلیق کے جوہر سے محروم ہوتا اور اس کا دوران محض گردش بیکار ہوتا، جس کا مطلب

ہے تکرار محض۔ یہی باعث ہے کہ وہ نطشے کے نظریے Eternal Recurrence کو محض Eternal Repitition قرار دیتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر "کڑی میکانیت"۔ اس مضمون کو ان کے اپنے بیان میں اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے:

"قرآن پاک کا ارشاد ہے: کل یوم ھو فی شان۔ لہٰذا زمان حقیقی کی زندگی زمان متسلسل کی زنجیروں سے آزادی اور ابداع کا عمل ہے اور اس لیے تخلیق کا عمل بھی آزادی کا عمل ہے کیوں کہ تخلیق تکرار کی ضد ہے اور تکرار خاصہ ہے میکانیاتی طریق کار کا۔"

نظم 'زمانہ' کا ایک شعر ہے:

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

اب اگلا مرحلہ آتا ہے۔ تکرار سے تو انکار ہوچکا لیکن کیا مخلوقات یا ممکنات کو کسی بندھے بندھائے انداز میں اور ضابطے کی کڑی زنجیروں میں کس کے

خارج کے ہر لحظے سے حکم دیا جاتا ہے یا ادب سکھایا جاتا ہے یا خود ہر شے کے اندر وہ جوہر ودیعت کردیا گیا ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے تکمیلی مراحل خود اپنے اندر سے اور اپنی ذات میں طے کررہا ہے۔ حضرت علامہ خود زمانے کو امکان غیر متعین جانتے ہیں اور کارخانۂ قدرت کو قوائے ذاتی سے مالا مال جانتے ہیں جو اندرونی زور نمو سے بروئے کار آتی رہتی ہیں۔ حضرت علامہ کے الفاظ میں:

"ہم زمانے کی حرکت کا تصور ایک

الٰہ آباد میں
انجمن ترقی اردو (ہند) کی
شاخ کا قیام

گزشتہ دنوں الٰہ آباد میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ کا قیام عمل میں آیا، جس کی تفصیلی خبر صفحہ ۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔ (ادارہ)

پہلے سے کھینچے ہوئے خط کی شکل میں نہیں کریں گے کیوں کہ یہ خط ابھی کھنچ رہا ہے اور اس سے مطلب ہے وہ امکانات جو ہو سکتا ہے وقوع میں آئیں اور ہو سکتا ہے نہ آئیں۔ یہ وقوع میں آئیں یا نہ آئیں Open Possibilities کا ترجمہ ہے (آپ چاہیں تو اس کا ترجمہ 'غیر معین امکانات' کرلیں)۔ اس نکتے کی وضاحت کے طور پر سطور ذیل بھی ملاحظہ ہو جائیں۔

''وہ ہستی جس سے اس کو جزو و کل کا سا تعلق ہے اس میں اضافہ ممکن ہے، ہم اس کو غیر محدود کہتے ہیں تو ان معنوں میں کہ اس کی وسعت پر کوئی حد قائم نہیں کی جا سکتی، یعنی وہ غیر محدود ہے تو بالقوۃ، بالفعل نہیں اور اس لیے فطرت کا تصور بھی ایک زندہ اور ہر لحظہ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی وحدت نامیہ کی حیثیت سے کرنا چاہیے جس کے نشو و نما پر ہم خارج سے کوئی حد قائم نہیں کر سکتے۔ اس کی کوئی حد ہے تو داخلی، یعنی وہ ذاتِ مشہود جو اس میں جاری و ساری ہے اور جس نے اس کو سہارا دے رکھا ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے: وان الی ربک المنتہی۔''

یہ ہے اس جہاں کی کیفیت و فطرت جس میں آدم کو بسایا گیا ہے۔ یہ جہاں آدم کا تربیت کدہ بھی ہے اور تجربہ گاہ بھی۔ اسے اپنی جملہ صلاحیتوں کی مدد سے یہاں اپنا مقام آپ پیدا کرنا ہے۔ ہر فرد آدم ایک ذمہ دار ہستی ہے، ہر ایک کو اپنے عمل کا بار خود اٹھانا ہے اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی اور قیامت کے روز خدا کے حضور بھی ہر ایک کو فرداً فرداً جانا ہے۔ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا۔

واضح ہے کہ اگر اسے قیامت کے روز اپنے ذاتی جملہ اعمال کے لیے جواب دہ ہونا ہے تو یہ جواب دہی اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک یہ بات مان نہ لی جائے کہ آدمی پر اس کے اعمال کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، جس کا مطلب ہے کہ وہ پسند و ناپسند کا مالک ہے، وہ صاحب فکر و ارادہ ہے، اور وہ انتخاب و اختیار (Choice) کی صلاحیت سے بہرہ مند ہے۔ اگر وہ بیدار ہے اور تعمیر ذات کے لیے سرگرم ہے تو اس کی حیثیت کچھ اور ہے، اور اگر وہ غافل ہے اور کم ہمتی و ضعف ارادہ کا مظاہرہ کرتا ہے تو محروم رہتا ہے۔ یہ زبان زمانہ یوں کہ لیجیے:

ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ
نہ تھا اگر تو شریک محفل، قصور تیرا ہے یا کہ میرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

حضرت علامہ کی 'تشکیل جدید' کے پہلے خطبے کی پہلی سطور یہ ہیں:

''یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے اور ترکیب کیا ہے؟ کیا اس کی ساخت میں دوامی عنصر موجود ہے؟ ہمیں اس سے کیا تعلق ہے اور ہمارا اس میں کیا مقام ہے؟ باعتبار اس مقام کے ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟''

اس آخری جملے سے یہ خوبی عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ آدم کو معنوی اعتبار سے کوئی بنا بنایا اور بندھا بندھایا وجود نہیں جانتے کہ جس طرح بنایا گیا بن گیا، جس طرح باندھ دیا گیا بندھ گیا۔ یوں کہ اس میں ارتقا و کمال کی کوئی اہلیت، ہمت اور عزیمت موجود نہیں۔ 'ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟' تقاضا کرتا ہے کہ اپنے طرز عمل کی تعیین خود آدم ہی کو کرنا ہے، اختیار (Choice) اس کا اپنا ہے۔

حضرت علامہ نے 'تقدیر' کی اس تعبیر سے سخت اختلاف کیا ہے جسے عرف عام میں قسمت کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اس اختلاف کا اظہار کھل کے بھی کیا ہے۔ تقدیر کی اس عام اور مروج تعبیر کا مفہوم تو یہ ہوا کہ آدمی دنیا کے میدان عمل میں وارد ہو کر بھی آزادی عمل کا حق نہیں رکھتا، اسے جیسا بنا کر ارسال کر دیا گیا ہے ویسا ہی رہتا ہے، جس کے نتیجے میں بڑے اعتماد کے ساتھ فرض کیا جا سکتا ہے کہ جو مقدر ہے وہ تو ہو کر رہے گا، سعی و سرگرمی بے سود ہے۔ نہ حال سنوارا جا سکتا ہے نہ مستقبل۔ اسی طرح نہ حال بگاڑا جا سکتا ہے نہ مستقبل۔ یہ وہ کیفیت ہے جسے 'ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا' ہونا قرار دیا جائے گا اور اسی کیفیت کا پیدا کردہ وہ رویہ تھا کہ مسلم ملت 'تن بہ تقدیر' ہو کر بیٹھ رہی اور مغرب کی مادہ پرست قوموں نے آگے بڑھ کر ان کا چارج سنبھال لیا۔

فرنگی صید بست از کعبہ و دیر
صدا از خانقاہاں رفت 'لا غیر'
حکایت پیش ملا باز گفتم
دعا فرمود 'یا رب عاقبت خیر'

یہ خیال یا عقیدہ 'نفی خودی' کا متضمن ہے۔ اس خیال کے حامی افراد ولولے اور عزم کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی حیثیت جمادات و نباتات کی سی ہو کر رہ جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ نباتاتی و جماداتی حیثیت اس حیثیت سے نہایت پست ہے جو آدمی کو نیابت الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کے باعث حاصل ہے۔ ہر فرد اپنی تقدیر چنتا ہے اور 'ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ'۔ افراد کی انفرادی تقدیر کیا ہے؟ انھوں نے اپنے لیے کیا انتخاب کیا؟ اس انتخاب میں ولولہ و عزم اور بلندی و ترقی کا معیار کیا ہے اور مقاصد کیا ہیں؟ ان مقاصد میں از راہ مقصود توحید کس قدر ہے؟

اگر افراد معاشرہ اپنی جگہ پست ہمت اور کج بیں ہیں تو پورا معاشرہ پست ہمت اور کج بیں ہوگا۔ چناں چہ انفرادی کجیت اور اجتماعی کجیت میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ افراد کا رویہ کچھ اور ہو اور پورے معاشرے کا انداز کچھ اور ہو۔ تقریباً ایک ہی رویہ ہر شعبے میں کام کرتا ہے اور اسی عادی رویے کے مطابق اس معاشرے کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ اگر اکثریت معیاری افراد کی ہو تو اس میں ایک تعداد غیر معیاری افراد کی بھی کھپ جائے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی قوم کے افراد کا حاوی عنصر زوال پذیر اور غیر معیاری ہو اور وہ قلیل تعداد کے قابل اور اہل افراد کے باعث فطرت کی جانب سے عائد کردہ اصولی سزا اور عقوبت سے بچ جائے:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اسی نظریے کو انھوں نے 'اسلامی ثقافت کی روح' والے خطبے میں قرآن کے احکام کی روشنی میں یوں بیان کیا ہے۔

''قرآن پاک نے تاریخ کو ایام اللہ سے تعبیر کیا ہے اور اسے علم کا ایک سرچشمہ ٹھہرایا ہے۔ اس کی ایک اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انھیں اپنی بداعمالی کی سزا اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے۔''

غرض جس معاشرے کے افراد کا یہ عالم ہو، وہ پورا معاشرہ کاہل ہوگا جس میں نہ تحفظ کی امنگ ہوگی نہ ترقی کی ترنگ، اس لیے کہ امنگ عطا ہے مقاصد کی اور ترنگ بخشش ہے امید، کامرانی اور لذت کامگاری کی۔ اعلیٰ مقاصد کی خاطر اٹھائی جانے والی مشقت جملہ قوائے حواس کو بیدار رکھتی ہے۔ اس لیے مشقت پورے وجود انسانی کی اجتماعی کاوش کا نام ہے اور یہ پوری شخصیت کا انتخاب (Choice) ہے۔ بے مقصد اور بے منصوبہ قوم کی ذہانت منجمد ہو جاتی ہے، حافظہ متحجر ہو جاتا ہے، حواس سو جاتے ہیں۔ بے حال قوم جس کا ماضی خواب ہو اور مستقبل خیال۔

حضرت علامہ نے ملت اسلامیہ سے تعلق رکھنے والی اقوام کو اسی 'نیم مردہ' حالت میں دیکھا اور چوں کہ وہ برعظیم ہند و پاک کے مسلمانوں کو بہت ہی قریب سے دیکھ رہے تھے اس لیے کہ وہ ان میں موجود تھے لہٰذا اُن کی 'تن بہ تقدیر' صورت حال انھیں براہ راست اذیت دیتی تھی:

بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش
بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

طنزاً فرمایا کہ ہندی مسلمان کو خوشخبری دے دو کہ ایک بہشت وہ بھی ہے جو خیرات کے طور پر دے جائے گی۔ مطلب یہ کہ اگر ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر روشن اور مسرت بخش مستقبل کی امیدیں دل میں پال رہے ہو تو جان لو کہ یہاں لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کا اصول کارفرما ہے۔ یہاں خوشیاں کمائی جاتی ہیں۔ یہ اس قرآن کا فیصلہ ہے جسے حضرت علامہ 'کتاب زندہ' کہتے ہیں:

اے چو شبنم بر زمیں افتندہ
در بغل داری کتاب زندہ

اس کتاب زندہ کے ہوتے مسلمان کیوں مر گئے؟ اس کی توجیہ خود حضرت علامہ کسی حد تک ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''لیکن اس تقدیر پرستی کی ایک تاریخ ہے جس کی تشریح کے لیے دفتر چاہیے۔ یہاں یہ عرض کر دینا کافی ہوگا کہ یہ تقدیر پرستی جس کو مغربی مصنفین لفظ 'قسمت' سے ادا کرتے ہیں، کچھ تو نتیجہ تھی بعض فلسفیانہ افکار اور کچھ سیاسی مصلحت پسندیوں کا۔ پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی کی وہ قوت جو اسلام نے مسلمانوں کے اندر پیدا کی تھی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور آگے چل کر جب فلسفے نے اس امر کی تحقیق میں کہ لفظ علت کا اطلاق اگر ذات ایزدی پر کیا گیا تو اس کے معنی کیا ہوں گے؟ علیٰ ہذا۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ علت و معلول کو جو آپس میں نسبت ہے زمان اس کی شرط ضروری ہے، ایک ایسے خدا کا تصور قائم کیا جو موجودات عالم سے ورا و الورا و قدیم ہی سے موجود ہے اور اس لیے خارج سے اس پر عمل کر رہا ہے، لہٰذا کہا گیا کہ علت و معلول کا سلسلہ چوں کہ بالآخر ذات خداوندی پر ختم ہو جاتا ہے، لہٰذا ہر صورت جو کچھ بھی ہو رہا ہے خدا ہی کے حکم سے ہو رہا ہے۔''

''جو کچھ بھی ہو رہا ہے خدا ہی کے حکم سے ہو رہا ہے'' میں کوئی خرابی نہ تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک طرف عیاش اور ظالم اور دوسری طرف کاہل اور آرام طلب لوگوں نے اپنی کھلی افراط و تفریط پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ عذر قائم کر لیا کہ ہم اپنی طرف سے تو کچھ نہیں کرتے اور نہ ہی کرنے پر قادر ہیں، ورنہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا نے اپنے حکم مطلق اور قدرت کاملہ کی بدولت انسان کو تمیز و شعور کا جوہر دیا اور خیر و شر کو سمجھنے کی اہلیت سے نوازا ہے (ان احسنتم احسنتم لانفسکم و ان اساتم فلھا) اسے عزم و ارادہ بھی عطا کیا ہے اور تحمل و برداشت کا ملکہ بھی ارزانی کیا ہے تو اس سے اللہ کی شان خلاقی اور حاکمیت مطلقہ سے انکار کیوں کر واجب آتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ نباتات و جمادات اور بہائم اس کارخانہ قدرت میں جاری و ساری بنیادی اور دائمی اصولوں کے مطابق اور مقررہ معیاروں کے موافق پیدا ہوں، زندگی بسر کریں اور چل بسیں۔ مطلب یہ کہ ان کے امکانات و مقدرات محدود ہیں مگر انسان کے بارے میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ جملہ موجودات کو مسخر کرے گا۔ گویا انسان کی شکل میں قادر مطلق نے ایک ایسا وجود تخلیق کیا جس میں خود اس کی ربانی صفات کا عکس اور زندہ پرتو موجود ہو۔ اسی وجود کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسے اللہ کی روح سے حصہ میسر آیا (ونفخت فیہ من روحی)۔ اگر وہ اس روح کے ایک حصے کا مالک نہ ہوتا تو اس سے ہرگز یہ نہ کہا جاتا کہ وہ اللہ کے اخلاق اپنائے (تخلقوا باخلاق اللہ) اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مادی کائنات کے بندھنوں کو اپنی راہ میں حائل نہ ہونے دے۔ اگر وہ بھی محض

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

یاد رفتگاں

پروفیسر کبیر احمد جائسی کی یاد میں

پہلی قسط

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی (ادب کدہ، مبراج پور، انور گنج، اعظم گڑھ (یوپی)-۲۷۶۰۰۱)
E-mail: azmi408@gmail.com

ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر کبیر احمد جائسی (۲۰۱۳ء-۱۹۳۷ء) کی شخصیت علم و ادب اور تحقیق و تنقید کے لحاظ سے تو منفرد تھی ہی، رہن سہن، مزاج و مذاق اور اپنے طرز عمل کے لحاظ سے بھی بڑی پرکشش تھی۔ وہ ایسے شخص تھے جو پرانی دنیا کے بجائے نیا چمن آباد کرنے کے قائل تھے۔ بہ الفاظ دیگر وہ نئی راہوں کے مسافر تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں میں بڑا تنوع اور طرفگی ہے۔

بہ ظاہر وہ عالم نہ تھے مگر ایران کی تفسیروں پر انھوں نے جو معرکہ آرا کتاب لکھی ہے اور جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے، ان کے وسیع و عمیق مطالعے اور تفسیروں پر ان کی گہری نظر کی گواہی دیتی ہے۔ ان کا یہ کام ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

اردو اور فارسی ادب سے متعلق انھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ ان کے گہرے ادبی و تنقیدی شعور کا نتیجہ ہیں اور اس لیے وہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ خاص طور پر حافظ اور فانی کی شخصیت اور شاعری پر ان کی نگارشات بڑی قابل قدر ہیں، جن کا اعتراف اہل علم اور بعض ارباب کمال نے بھی کیا ہے۔ ان کے خاکوں کے دو مجموعے 'دو موڑ ہو گئے انجمن' اور 'نقوش جاوداں' شائع ہوئے۔ ایک ان کی زندگی میں شائع ہوا جب کہ دوسرا ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر شباب الدین (صدر شعبۂ اردو شبلی کالج اعظم گڑھ) کی ترتیب و تدوین اور تقدیم کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ اس میں انھوں نے جن شخصیات کے خاکے لکھے ہیں ان کی علمی و عملی زندگی اور خدمات کا دائرہ وسیع اور متنوع ہے باوجود اس کے جائسی صاحب نے ان خاکوں میں ان کی ایسی خوب صورت مصوری کی ہے کہ ان کی شخصیت کے تمام بنیادی خد و خال پورے طور پر نمایاں اور ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جائسی صاحب کو خاکہ نگاری پر بڑا عبور حاصل تھا۔ آئندہ جب بھی خاکہ نگاروں کا تجزیہ ہوگا تو جائسی صاحب کی کاوشوں سے صرف نظر کرنا آسان نہیں ہوگا۔

جائسی صاحب شاعر بھی تھے اور اچھے اشعار کہتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ 'صحرا صحرا' ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ بعد میں انھوں نے 'جاوداں مضراب' شائع کیا، جو اصلاً ایک انتخاب ہے۔ اس میں ان کا تمام اہم کلام آگیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بلند رتبہ شاعر تھے البتہ انھوں نے شاعری کی طرف پوری توجہ نہ دی ورنہ اس کے مظاہر ایک نئی شناخت قائم کرتے۔

جائسی صاحب کا شعری نام صبا جائسی تھا۔ اسی نام سے وہ دور طالب علمی میں شاعری کرتے رہے۔ اعظم گڑھ میں یگی اعظمی سے اصلاح لی۔ علی گڑھ پہنچے تو معاصر اہم ادبا و شعرا کے یارانے ان میں تازگی پیدا کی۔ آپ اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں میں کس قدر طرفگی تھی کہ اس کی داد پروفیسر آل احمد سرور نے دی۔

جائسی صاحب مختلف اوقات میں شبلی کالج میگزین، ماہنامہ 'ادیب' علی گڑھ، ماہنامہ 'تہذیب الاخلاق' اور ماہنامہ 'کانفرنس گزٹ' سے وابستہ رہے۔ اہتمام سے ان کے لیے اداریے اور مضامین لکھے۔ اس سلسلے کا ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مذکورہ رسائل کے معیار سے کسی طرح کا تغافل نہیں برتا بلکہ ان کے معیار کو بلند کرتے اور ان میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اردو رسائل کے مطالعے اور ان پر تحقیق و ریسرچ کے کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں جائسی صاحب کی خدمات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ ضروری ایک کام ان کے مضامین و مقالات کی ترتیب و تدوین اور اشاعت ہے۔ امید ہے اس کی طرف توجہ دی جائے۔ ان کے شاگرد عزیز ڈاکٹر شباب الدین صاحب سے اس کی توقع کرنا شاید نامناسب نہ ہو۔

پروفیسر جائسی صاحب کی خدمات میں ان کی عبدالسلام شناسی بھی شامل ہے۔ وہ جب شبلی کالج اعظم گڑھ کے طالب علم تھے تو ادیب شہیر مولانا عبد السلام ندوی کے قریب آئے۔ ان کی محفلوں کا حصہ بنے اور ان سے استفادہ کیا اور ان کی عظمت دل و دماغ میں پیوست ہوئی تو اس طرح پیوست ہوئی کہ آخر تک نقوش جاوداں بنی رہی۔ انتقال سے دو روز پہلے انھوں نے راقم سے جو گفتگو کی وہ بھی مولانا عبدالسلام ندوی ہی سے متعلق تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ادبی دنیا کو مولانا عبدالسلام ندوی کے ادبی کارناموں سے مسلسل واقف کرانے کا سہرا انھی کے سر ہے۔ وہ عمر بھر ان پر مضامین و مقالات لکھتے اور لکھواتے رہے۔ تقریباً ان کی تمام محفلوں میں کسی نہ کسی نوع سے اور کسی نہ کسی انداز سے مولانا عبدالسلام ندوی کا ذکر ضرور آجاتا۔ میری ان سے پہلی شناسائی ان کی ایک کاوش 'مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں' سے ہوئی۔ اس کو انھوں نے جس خوبی اور مہارت سے مرتب کیا ہے وہ انھی کا حصہ تھا۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اسے جب انھوں نے مرتب کیا تھا اس وقت وہ شبلی کالج کے ایک طالب علم تھے اور ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔ اس سے بھی پہلے وہ ایک کتاب فانی کی شاعری پر لکھ چکے تھے۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دور طالب علمی میں ان کے اندر کتنی پختگی، علمی سنجیدگی اور ادبی رعنائی آچکی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب استاذی مولانا مجیب اللہ ندوی دارالمصنفین میں رفیق تھے، اسی زمانے میں میرے ان سے گہرے مراسم قائم ہوئے، جو اخیر تک باقی رہے۔ حضرۃ الاستاذ ۱۹۶۹ء میں دارالمصنفین سے جامعۃ الرشاد کے قیام کی وجہ سے علاحدہ ہو گئے۔ چناں چہ علاحدگی کے بعد وہ یکسو ہو کر جامعۃ الرشاد کے قیام و استحکام میں جٹ گئے۔ جائسی صاحب اگرچہ اس وقت اعظم گڑھ کو خیر باد کہہ چکے تھے تاہم جامعۃ الرشاد کے قیام و استحکام میں انھوں نے بھی حصہ لیا۔ فروری ۱۹۸۲ء میں حضرت الاستاذ نے ماہنامہ 'الرشاد' جاری کیا تو جائسی صاحب اس کے اولین مضمون نگاروں اور خریداروں میں تھے۔ علی گڑھ میں ماہنامہ الرشاد کا حلقہ بنانے میں برادر گرامی ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کے علاوہ انھوں نے بھی حصہ لیا اور یہ جذباتی رشتہ اخیر تک قائم رہا۔ ماہنامہ الرشاد کی ڈاک میں ان کے متعدد خطوط شائع ہوئے جن میں ان کے مفید مشورے اور تجاویز شامل ہیں۔ ان کے درج ذیل مضامین اولاً ماہنامہ الرشاد ہی میں شائع ہوئے۔

۱- ہند اسلامی تہذیب کے ایرانی اور زرتشتی عناصر، ستمبر ۱۹۸۲ء، ص ۲۳-۴۷
۲- فرقہ ملامتیہ سعید نفیسی کی نظر میں، دسمبر ۱۹۸۵ء، ص ۴۰-۵۰
۳- ایران میں فارسی تفسیر نویسی، قسط اول، اگست ۲۰۰۲ء، ص ۹-۱۹
۴- ایران میں فارسی تفسیر نویسی، قسط دوم، ستمبر/اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ۲۹-۳۸
۵- ایران میں فارسی تفسیر نویسی، قسط سوم، نومبر/دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۲۹-۳۶

ماہنامہ الرشاد کے مئی ۱۹۸۳ء- مارچ اپریل ۱۹۸۶ء- مئی جون ۱۹۸۶ء- دسمبر ۱۹۸۶ء- اپریل مئی جون ۱۹۸۹ء- اکتوبر نومبر ۱۹۹۰ء، ستمبر اکتوبر ۲۰۰۰ء شماروں میں ان کے خطوط شائع ہوئے ہیں۔

یہ فہرست ۲۰۰۲ء تک کی ہے۔ اس کے بعد بھی انھوں نے مولانا مرحوم کو متعدد خطوط لکھے جو الرشاد میں شائع ہوئے۔

جائسی صاحب کی جب کوئی کتاب شائع ہوتی تو وہ ماہنامہ 'الرشاد' میں تبصرے کے لیے ضرور بھیجتے چناں چہ ان کی کئی کتابوں پر حضرت الاستاذ نے تبصرے کیے ہیں البتہ اخیر میں دو کتابوں پر ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے تبصرے کیے۔ جائسی صاحب کی جن کتابوں پر ماہنامہ 'الرشاد' میں تبصرے شائع ہوئے، ان کی فہرست یہ ہے:

۱- انعکاس۔ تبصرہ مولانا مجیب اللہ ندوی، جولائی ۱۹۸۷ء، ص ۵۶-۵۷
۲- تاجیکی ادبیات کے بانی۔ تبصرہ مولانا مجیب اللہ ندوی، جولائی اگست ۱۹۸۹ء، ص ۶۷-۷۱
۳- جدید تاجیکی شعرا۔ تبصرہ مولانا مجیب اللہ ندوی۔ نومبر ۱۹۹۱ء، ص ۴۴-۴۵
۴- چند ایران شناس۔ تبصرہ مولانا مجیب اللہ ندوی، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۳۹
۵- محمد اقبال۔ تبصرہ مولانا مجیب اللہ ندوی، مئی ۱۹۸۳ء، ص ۹۰
۶- ایرانی تصوف۔ تبصرہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، نومبر ۱۹۹۳ء، ص ۴۷-۴۹
۷- ایران کی چند اہم فارسی تفسیریں، تبصرہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، جولائی اگست ۱۹۹۷ء، ص ۷۴-۷۵

۱۹۹۳ء میں حضرت الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندوی نے راقم کو ماہنامہ 'الرشاد' کی مجلس ادارت میں شامل کیا اور آہستہ آہستہ تقریباً پورا رسالہ میرے ذمے کر دیا۔ اس دوران انھوں نے راقم سے متعدد مضامین و مقالات لکھوائے اور اہل علم سے خط و کتابت کرائی۔ اسی تعلق سے راقم نے پروفیسر کبیر احمد جائسی صاحب کو بھی خطوط لکھے۔ اصلاً میں

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

گوالیار کے جوائز ہائر سیکنڈری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہ ہونا افسوسناک ہے

انجمن ترقی اردو گوالیار کے ایک وفد نے بی جے پی کے صوبائی صدر کو میمورنڈم پیش کیا

گوالیار (پریس ریلیز)۔ انجمن ترقی اردو شاخ گوالیار کے ایک وفد نے انجمن کے ریاستی سکریٹری وقار صدیقی کی قیادت میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے صوبائی صدر اور گوالیار پارلیمانی حلقے سے بی جے پی کے امیدوار نریندر سنگھ تومر سے ملاقات کی اور انھیں ایک میمورنڈم پیش کیا، جس میں کہا گیا ہے کہ گوالیار جیسے تاریخی، ثقافتی اور تعلیمی شہر میں لڑکوں کے لیے کسی بھی سرکاری ہائی اسکول یا ہائر سیکنڈری درجات میں اردو کی تعلیم کا نظم نہ ہونا حیرتناک ہی نہیں افسوسناک بھی ہے۔ اس وجہ سے آٹھویں درجے تک اردو پڑھنے والے طلبہ کو یا تو تعلیم کو ہی خیرباد کہنا پڑتا ہے یا پھر نویں درجے سے اردو کی پڑھائی سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ یہ صورت حال نہ صرف جمہوری نظام کے لیے باعث تشویش ہے بلکہ اپریل ۲۰۱۰ء سے مدھیہ پردیش میں نافذ حق تعلیم کے قانون کی سراسر خلاف ورزی بھی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ جن مڈل اسکولوں میں آٹھویں جماعت تک اردو پڑھانے کے انتظام ہیں انھیں پہلے ہائی اسکول اور اس کے بعد ہائر سیکنڈری اسکولوں میں تبدیل کیا جائے تاکہ نویں سے بارہویں جماعت تک اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاسکے۔

وقار صدیقی نے بتایا کہ فی الحال گوالیار میں لڑکیوں کے دو ہائر سیکنڈری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے انتظامات ہیں لیکن لڑکوں کے لیے ایک بھی اسکول میں یہ سہولت نہیں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اردو آبادی کی اکثریت والے علاقے میں واقع گورنمنٹ مڈل اسکول آواڑ پورہ اور گورنمنٹ مڈل اسکول مادھو گنج جس کا ذریعۂ تعلیم بھی آزادی سے پہلے اردو تھا۔ ان دونوں مڈل اسکولوں کو ہائی اسکولوں تک اپ گریڈ کیا جائے اور ان میں اردو پڑھانے کے انتظام کیے جائیں۔ نریندر سنگھ تومر صاحب نے وفد سے وعدہ کیا کہ الیکشن کے بعد جلد ہی وہ اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لے کر انجمن کے مطالبے کو عملی جامہ پہنانے کی ہرممکن کوشش کریں گے۔ وفد کے دیگر ممبران میں پروفیسر عبدالجلیل قریشی، سہیل احمد قریشی اور ناظم صدیقی کے علاوہ بی جے پی کے سرگرم لیڈر نیاز محمد بھی شامل تھے۔

اس سے پیشتر انجمن ہذا کا ایک وفد ضلع کلکٹر کو جن سنوائی پروگرام کے دوران میمورنڈم پیش کرچکا ہے اور ڈی ای او محترمہ صوفیہ فاروقی سے عرض داشت میں درج دونوں اسکولوں آواڑ پورہ مڈل اسکول اور مادھو گنج مڈل اسکول کو ہائی اسکول کا درجہ دینے اور اردو کی تعلیم کے انتظام کرنے کی گزارش کرچکا ہے۔ صوفیہ صاحبہ نے الیکشن کے فوراً بعد مناسب کارروائی کرنے کا وفد کو یقین دلایا۔

اردو کو تلنگانہ کی متوازی سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مشورہ

حیدرآباد (۳ اپریل)۔ انجمن ترقی اردو عظیم تر حیدرآباد کے زیر اہتمام ماہانہ ادبی اجلاس ۳۰ مارچ ۲۰۱۴ء کو ایوان صابر علی خان پورہ میں زیر صدارت جناب محمد مسعود علی خان فضلی (صدر شہری انجمن ترقی اردو عظیم تر حیدرآباد) منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی جناب اسلام مجاہد نے بہ عنوان 'ریاست تلنگانہ میں اردو کے موقف پر اپنے کلیدی خطاب میں کہا کہ آج پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے خواب غفلت سے بیدار ہوجائیں اور اردو زبان کو اس کا جائز و مستحق مقام دلانے کے لیے کمربستہ ہوجائیں۔ تلنگانہ میں اردو کو متوازی سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ جناب مسعود فضلی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ملک کی آزادی سے پہلے اردو زبان بلاتفریق مذہب، علاقہ اور رنگ و نسل ہر ہندوستانی کی مشترکہ زبان تھی اور آج بھی ہے۔ آج اردو زبان نہ صرف پورے ملک میں پوری آب و تاب کے ساتھ تابندہ ہے بلکہ پوری دنیا میں اس کی مقبولیت کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ ادبی اجلاس کے بعد جناب شوکت علی درد کی صدارت میں غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر سلیم عابدی، ڈاکٹر طیب پاشاہ قادری، ڈاکٹر سردار سلیم، انجم شافعی اور یوسف روش کے علاوہ شیخ اسماعیل صابر، قدیر سحر، باقر تحسین، تشکیل انور، سہیل عظیم، مخلص حیدرآبادی اور قابل حیدرآبادی وغیرہ نے اپنے کلام پیش کیے۔ (سیاست، حیدرآباد)

الٰہ آباد میں 'انجمن ترقی اردو (ہند)' کی شاخ کا قیام

الٰہ آباد۔ نورگنج واقع پروفیسر علی احمد فاطمی کی رہائش گاہ پر ڈاکٹر اشفاق حسین کی صدارت میں 'انجمن ترقی اردو (ہند)' کی شاخ الٰہ آباد میں قائم کیے جانے کے سلسلے میں ایک میٹنگ کا انعقاد کیا گیا، جس میں پروفیسر علی احمد فاطمی نے انجمن ترقی اردو کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یوپی کے مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں گی تاکہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں مزید پیش رفت ہوسکے۔ میٹنگ میں باقاعدہ انجمن کی الٰہ آباد شاخ کے عہدیداران کا اعلان کیا گیا، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

سرپرست : کامریڈ ضیاء الحق، پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، جناب ایم اے قدیر اور جناب ایس ایم اے کاظمی

صدر : پروفیسر علی احمد فاطمی

نائب صدر : ڈاکٹر فخر الکریم صدیقی اور جناب اقبال امیر

جنرل سکریٹری : جناب جاوید نظر

سکریٹری : ڈاکٹر فاضل ہاشمی اور ڈاکٹر حسین جیلانی

پبلشنگ سکریٹری : ڈاکٹر صہیب از عالم

معزز ممبران : ڈاکٹر علی حیدر، ڈاکٹر اشفاق حسین، ڈاکٹر محمد اشتیاق، جناب احمد حسنین، جناب اسرار گاندھی، ڈاکٹر اسلم الٰہ آبادی، ڈاکٹر صالحہ زریں، جناب سریندر کمار راہی، جناب اختر عزیز، جناب رفیق صفی پوری، جناب عاقل سلطانپوری، جناب علی عشرت، جناب صہیب، جناب نفیس احمد، جناب گیا توبندرا، محترمہ عارفہ بیگم، جناب محمد عرفان، جناب نورالاسلام، ڈاکٹر نشاط فاطمہ، محمد شکیل، محمد فہیم۔

سیاست دانوں کو اردو صرف انتخابات کے وقت یاد آتی ہے

نئی دہلی (۱۵ اپریل)۔ اردو کی شیرینی، اس کی کشش اور اس کی ترقی و ترویج کا خیال ہمیں انتخابات کے وقت ہی سیاست دانوں کے ذہنوں میں ابھرکر آتا ہے، مابقی برسوں میں یہ زبان اُن کے لیے غیر مانوس بن جاتی ہے۔ ممتاز شاعر جناب گلزار دہلوی نے ایک مشاعرے کے دوران تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انتخابات کے دنوں میں ہم سیاسی پارٹیوں کو اردو کے حق میں اپنی محبت کے اظہار، اس کی ترقی و ترویج کی باتیں کرتے ہوئے سنتے اور دیکھتے ہیں۔ 89 سالہ اردو شاعر نے 16 ویں جشن بہار کے موقعے پر منعقدہ عالمی مشاعرے میں کہا کہ سیاست دانوں کو اردو سے دلچسپی نہیں ہوتی، یہ لوگ ووٹ لینے کے لیے ہی اردو کا نام لیتے ہیں۔ اس مشاعرے میں ہندستان، پاکستان، جاپان کے علاوہ دیگر ملکوں کے ممتاز شعرا نے شرکت کی تھی۔ ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے دیگر شعرائے کرام نے کہا کہ اردو کی تمام تر اہمیت اور افادیت کو انتخابات کے موقعے پر یاد کیا جاتا ہے۔ ایک بار ووٹ لے لیا جائے تو پھر اس زبان کو بُری طرح نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ اردو کی خوب صورتی بھی انھیں یاد نہیں رہتی۔ تاہم اردو کے مستقبل سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے گلزار دہلوی نے کہا کہ اردو زبان بہت ہی اچھے دور سے گزر رہی ہے، اس کی مقبولیت میں اضافہ ہورہا ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اردو سیکھ رہے ہیں۔ امریکہ میں شکاگو سے لے کر کیلی فورنیا تک آپ کو ایسے کئی اسکول ملیں گے جہاں اردو سکھائی جاتی ہے۔ فرانس، اسپین، چیک جمہوریہ کے بشمول یوروپی یونین میں اردو کو پڑھایا اور سکھایا جاتا ہے۔ پاکستانی شاعرہ فہمیدہ ریاض نے بھی اردو کے مستقبل کے روشن امکانات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو کا مستقبل شاندار ہے۔ برصغیر ہند کے باہر بھی ملکوں میں اردو پڑھی اور بولی جارہی ہے۔ ساری دنیا میں اردو سے دلچسپی رکھنے والے عوام کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ مشاعرے میں مہمان خصوصی جسٹس ٹی ایس ٹھاکر نے تجویز رکھی کہ قانون کی پریکٹس کرنے والوں کو یہ خوب صورت زبان اردو سیکھنی چاہیے۔ (سیاست، حیدرآباد)

غالب اکیڈمی میں علیم صبا نویدی کی کتابوں کی رسم رونمائی

چنئی (پریس ریلیز)۔ دبستان ادب کے زیر اہتمام ۲۶ مارچ ۲۰۱۴ء کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں تامل ناڈو کے ممتاز شاعر، ادیب اور نقاد جناب علیم صبا نویدی کی دو کتابوں 'اردو شاعری میں نئے تجربے' اور 'اردو نظم کے جلسے' اور جناب انور پارسا جنکوی کے شعری مجموعہ 'لفظ لفظ آسمان' کی رسم اجرا ڈاکٹر ماجد دیوبندی اور جناب عظیم اختر کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس جلسے کی صدارت جناب محمد عمران انصاری (قومی نائب صدر آل انڈیا مومن کانفرنس) نے فرمائی اور نظامت جناب شمس رمزی نے انجام دیے۔ اس اجلاس کے بعد ایک مشاعرے

اسکولوں میں ملازم بھرتی کے وقت
تیسری زبان کے طور پر اردو اختیار کریں

نئی دہلی (۱۵ اپریل)۔ اردو زبان کے فروغ اور استحکام کے لیے دہلی میں متعدد تنظیمیں کام کر رہی ہیں، یہاں تک کہ حکومت بھی مسلمانوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ اردو کے مسائل حل کرنے کی یقین دہانی کرتی ہے جیسا کہ اردو زبان بھی ایک مسلمان ہو حالاں کہ کسی بھی زبان پر کسی بھی مذہب کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔

گزشتہ کئی برسوں سے اردو کے تعلق سے جتنی آوازیں اٹھی ہیں، شاید ہی اس سے پہلے اٹھی ہوں لیکن حکومت کی جانب سے جو رویہ رہا ہے وہ نہ صرف مقام افسوس ہے بلکہ لرزہ خیز بھی۔ اسکولوں میں اردو ٹیچروں کی تقرری کا معاملہ ہو یا پھر اردو کا شعبہ قائم کرنے کا، ہر جگہ سرد مہری اور تنگ نظری کا مظاہرہ کیا گیا اور جو کسر باقی تھی وہ اسکولوں کے پرنسپلوں نے پوری کر دی اور یہ عذر پیش کرتے ہوئے اردو کا شعبہ قائم نہیں کرنے دیا کہ مسلمانوں کے بچے تو مدرسوں اور مسجدوں میں اردو پڑھ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں تہذیب ہند سوسائٹی کے کارکنان نے گزشتہ سال کافی محنت کی تھی اور اسکولوں میں جاکر سروے بھی کیا تھا جس کے کافی مثبت نتیجے سامنے آئے تھے لیکن وقت کے بدلتے ہی سارے حالات پھر بدلنے لگے اور اس بار بھی وہی صورت حال ہے کہ آخر مشرقی دہلی کے بچے اردو کی تعلیم کہاں حاصل کریں؟ سوسائٹی کے صدر ماسٹر نثار احمد کا کہنا ہے کہ کردم پوری، بھیر نگر، مصطفی آباد اور سیما پوری مسلم اکثریتی علاقے ہیں، اس کے باوجود پرائمری یا پرائمری سطح کے اسکولوں میں اردو کا کوئی انتظام نہیں ہے اور نہ ہی حکومت سے منظور شدہ اسکولوں میں اردو کا نظم ہے، اس کی وجہ سے ہمارے بچے اردو سے نابلد ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ اردو کے تحفظ و بقا کے لیے کمربستہ ہوں اور داخلہ کراتے وقت سنسکرت یا پنجابی نہ لیں اور اگر وہاں کے پرنسپل یا اور کوئی اسٹاف متعصبانہ ذہنیت رکھتا ہے تو اس کے خلاف ایکشن لیں۔

قدیر خاں نے کہا کہ جب تک ہم اردو زبان کے تئیں بیدار نہیں ہوں گے، تب تک اسی طرح ناانصافی ہوتی رہے گی، اس لیے وقت کا تقاضا ہے کہ ہم لاکھ بچوں کو مدرسے یا مسجد میں اردو پڑھا رہے ہیں لیکن ہمیں اسکولوں میں بھی بچوں کو اردو زبان دلانا ہے تاکہ وہاں کے پرنسپلوں کا یہ عذر کام نہ آسکے کہ جب پڑھنے والے ہی نہیں ہیں تو کس کے لیے اردو کا شعبہ قائم کریں۔

رضائے مصطفی سوسائٹی کے صدر حاجی آزاد نے کہا کہ مشرقی دہلی کے مسلم اکثریتی علاقوں کے اسکولوں میں اردو شعبے کا قائم نہ کرنا محکمہ تعلیم کی تنگ نظری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (انقلاب۔دہلی)

اردو کے معاملے میں کسی بھی سیاسی پارٹی کے امیدوار کی نیت صاف نہیں

جونپور (یکم اپریل)۔ جونپور ضلع میں ان دنوں انتخاب کا خمار ہر کسی کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس میں سیاسی لیڈران ہوں یا عوام ہر کوئی اپنے امیدواروں کی جیت کے لیے کوشاں ہے اور ان سیاسی لیڈران کی زبانیں جہاں اس وقت شیریں ہوگئی ہیں وہیں ان کی نظر میں اقلیتوں کا ووٹ بینک ان کی کامیابی کا راز سمجھا جا رہا ہے اور ہر سیاسی لیڈر جب اقلیتوں کے علاقے میں پہنچتا ہے تو وہ خود کو ان کا ہمدرد اور ان کی لڑائی لڑنے والا بتاتا ہے۔ لیکن معاملہ اگر زمینی سطح پر دیکھا جائے تو بالکل مختلف ہے۔ ان دنوں ضلع میں تمام سیاسی پارٹیوں نے ضلع کی صدر سیٹ و مچھلی شہر محفوظ سیٹ سے امیدواروں کے نام کا اعلان کر دیا ہے۔ ان میں جونپور سیٹ پر اقلیتی ووٹ فیصلہ کن ہے۔ اس سیٹ پر مسلم ووٹ 37 فیصد کے قریب ہیں اور اس سیٹ پر ہر سیکولر پارٹی کے لوگوں کی نگاہیں اقلیتی ووٹوں پر ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ ان کا ووٹ جس امیدوار کے حق میں گیا وہ کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے لیکن بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ایک تو یہاں پہلے سے ہی سیاسی پارٹیوں نے کسی بھی مسلم امیدوار کو موقع نہیں دیا تو وہیں ان کے امیدوار اقلیتوں کے حق کی بات ضرور کر رہے ہیں لیکن وہ اقلیتوں کے کتنے مخلص ہیں جب ان سے سابقہ پڑتا ہے تو سارے راز عیاں ہو جاتے ہیں۔ اردو زبان کا حق دلانے کا دعویٰ کرنے والے ان سیاسی امیدواروں کے گھر پر نہ تو کوئی اردو اخبار آتا ہے اور نہ ہی یہ لوگ کسی اردو اخبار میں اپنی تشہیر ہی کرواتے ہیں۔ ہاں اگر خدانخواستہ بھی کسی اردو اخبار والے کو موقع دے بھی دیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انھوں نے اردو اخبار کے اوپر نہیں بلکہ پوری قوم پر احسان کیا ہو۔ ہر سیاسی لیڈر جب کوئی پروگرام کرتا ہے تو جہاں وہ ایک جانب ہندی اخباروں کا سہارا لیتا ہے وہیں اردو اخبارات کا بھی سہارا ضرور لیتا ہے لیکن جب اردو والوں کو ان کے حق دینے کی بات آتی ہے تو بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔

(انقلاب۔دہلی)

حیدرآباد کے نئے شہر اور مضافات میں
اردو میڈیم جونیر و ڈگری کالج کا قیام ناگزیر

حیدرآباد (۱۵ اپریل)۔ حیدرآباد کے نئے شہر اور مضافاتی علاقوں میں کئی سرکاری اردو میڈیم پرائمری اور ہائی اسکول قائم ہیں، تاہم نئے شہر کے کسی بھی علاقے میں اب تک اردو میڈیم جونیر کالج کا قیام عمل میں نہیں آیا ہے۔ محکمہ تعلیمات کے حکام کے مطابق خیریت آباد منڈل ۱ میں اردو میڈیم کے دو پرائمری اور دو ہائی اسکولس ہیں۔ اسی طرح خیریت آباد منڈل 2 میں اردو میڈیم کے دس پرائمری اور تین ہائی اسکول ہیں جب کہ امیر پیٹ منڈل میں تین پرائمری اور دو اردو میڈیم ہائی اسکول ہیں۔ دوسری جانب ضلع رنگاریڈی کے تحت آنے والے بالانگر منڈل میں پانچ پرائمری اور دو ہائی اسکولس ہیں۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں اردو میڈیم طلبہ ان تمام اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ تاہم دسویں جماعت میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد نئے شہر کے علاقے بالانگر، موتی پیٹ، بورا بنڈہ، ایراگڈہ، صنعت نگر، ایس آر نگر، امیر پیٹ، یوسف گوڑہ، رحمت نگر، ایلا ریڈی گوڑہ، پنجہ گٹہ، بنجارہ ہلز، جوبلی ہلز کے علاوہ دیگر علاقوں کے اردو میڈیم طلبہ و طالبات انگریزی میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں یا جونیر اور ڈگری کالج قریب نہ ہونے کی وجہ سے اردو میڈیم سے دسویں جماعت کامیاب طلبہ کو مجبوراً ترک تعلیم کرنا پڑ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میڈیم سے ایس ایس سی کامیاب طالبات کی ایک بڑی تعداد میں ترک تعلیم کے رجحان میں اضافہ دیکھا جا رہا ہے۔ حیدرآباد کے نئے شہر میں جونیر و ڈگری کالج کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اردو داں عوام کا کہنا ہے کہ امیر پیٹ یا ایس آر نگر جیسے علاقوں میں اردو میڈیم جونیر کالج قائم کرنے سے اردو میڈیم طلبہ کو فائدہ ہوگا۔ مقامی طلبہ تنظیموں کے قائدین کا کہنا ہے کہ نئے شہر کے انگریزی اور تلگو میڈیم کے لیے نجی اور سرکاری کالج ہیں تاہم نئے شہر کے کسی بھی علاقے میں اب تک اردو میڈیم کے سرکاری کالج کا قیام عمل میں نہیں آیا۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ نئے شہر کے اسمبلی حلقے خیریت آباد، صنعت نگر، جوبلی ہلز سے اب تک تلگو دیشم اور کانگریس کے ارکان اسمبلی نمائندگی کرتے آئے ہیں لیکن منتخب عوامی نمائندوں نے اردو میڈیم جونیر کالج کے قیام کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا ہے۔ ایس آر نگر سے تعلق رکھنے والے ایک شہری شیخ ایوب کا کہنا ہے کہ حیدرآباد اور رنگاریڈی اضلاع میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ تاہم حکام پرانے شہر کے علاقوں تک ہی اردو زبان کو محدود کر رہے ہیں۔ سمیرہ نامی خاتون نے بتایا کہ نئے شہر کے اردو داں ووٹروں کو اپنی جانب راغب کرنے کے لیے سیاست داں اردو پمفلٹ کا سہارا لیتے ہیں۔ تاہم اقتدار میں آنے کے بعد اردو داں عوام اور اردو زبان کے تحفظ کے لیے اقدام نہیں کرتے ہیں۔ مقامی لوگ ضلع کلکٹر حیدرآباد و رنگاریڈی سے نئے شہر میں بھی ایک سرکاری اردو میڈیم جونیر کالج کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ صنعت نگر کے عباس شریف (اجو) نے انتخابی تشہیری مہم کے لیے آنے والے امیدواروں سے بھی اردو میڈیم جونیر کالج کے قیام کا مطالبہ کرنے کی عوام سے اپیل کی ہے۔ نئے شہر کے اردو داں عوام رضاکارانہ تنظیموں سے بھی نئے شہر میں جونیر کالج کے قیام کی تجویز پر غور کرنے کی اپیل کر رہے ہیں۔

(سیاست۔حیدرآباد)

کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت دبستان ابر کے سرپرست جناب اسرار جلیسری نے کی۔ مشاعرے میں جناب علیم صبا نویدی، اشفاق الرحمن سنبھلی، شاداب بے دھڑک اور انور یار جنگوی کے علاوہ ڈاکٹر ماجد دیوبندی، اسرار جلیسری، جنید اختر، سلیم امروہی، انجم جعفری، اروند شرما، نشتر امروہی، ایس پی ظفر، احمر امروہی، محسن رضوی، احسان شکرم پوری، ماہر وکمر، راشد باقی حیا اور پریتی راوت نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

تلنگانہ میں اردو کو اُس کا واجب حق دینے کا مطالبہ

حیدرآباد (۲ اپریل)۔ راشٹریہ اپادھیہ پنڈت پریشد (RUPP) تلنگانہ کا ایک اجلاس صدر دفتر سکندرآباد واقع وارث گوڑہ میں منعقد ہوا جس میں تلنگانہ کے دس اضلاع کے صدور اور جنرل سکریٹریز کے علاوہ تلگو، اردو اور ہندی تلگو پنڈتوں نے شرکت کی جس میں سرکاری ہائی اسکولوں میں پڑھانے والے اردو، تلگو، ہندی پنڈتوں کے اہم مسائل کی یکسوئی کے لیے قیام تلنگانہ کے بعد وجود میں آنے والی ریاستی حکومت سے کامیاب نمائندگی کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں دس اضلاع پر مشتمل تلنگانہ ریاست میں تلگو کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو بھی سرکاری زبان کا موقف دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ ریاست بھر میں سرکاری ہائی اسکولوں میں پڑھانے والے تمام گریڈ II پنڈتوں کو اسکول اسسٹنٹ پر ترقی دینے کا مطالبہ کیا گیا۔

(سیاست۔حیدرآباد)

اک دیا اور بجھا

اردو کے مشہور و ممتاز ادیب و شاعر جناب سید شکیل دسنوی کا ۱۳ اپریل ۲۰۱۴ء کو کٹک (اڑیسہ) میں طویل علالت کے بعد 73 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کے پس ماندگان میں دو بیٹے ہیں۔ ان کی اہلیہ زینت جہاں کا چند برس قبل انتقال ہو چکا تھا۔ سید شکیل دسنوی کی ولادت ۲۱ فروری ۱۹۴۱ء کو بہار شریف میں ہوئی تھی۔ وہ ۱۹۹۹ء میں سپرنٹنڈنٹ انجینئر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انھیں اردو زبان و ادب اور شاعری سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ ان کے اب تک پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

اردو کے معروف شاعر جناب اطہر حسین جعفری (اطہر سہارنپوری) کا دہلی کے ہرانکا فیکٹری میں حادثے کا شکار ہونے سے موت ہوگئی۔ مرحوم کی عمر 70 برس تھی۔ ان کے پس ماندگان میں بیوہ، دو لڑکیاں اور دو لڑکے محمد انجم جعفری اور انور جعفری جو کئی برسوں سے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شعر و شاعری اور اردو صحافت سے وابستہ ہیں۔ اطہر سہارنپوری مرحوم نعت، غزل، نظم اور مرثیے کے بہترین شاعر تھے جن کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ برسوں سے دہلی کے ہرانکا میں واقع فیکٹری میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : جوئے شیر
مصنف : محمد شاہد پٹھان
قیمت : ۳۵۰ روپے
ملنے کا پتا : 26-1625، پاڈی منزل کسیلا اسٹریٹ، ایم ڈی روڈ، جے پور۔302004
تبصرہ نگار : غلام مرتضیٰ راہی

محمد شاہد پٹھان بلاشبہ اردو کی نئی نسل کے ممتاز ادیب و شاعر ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کی متعدد کتابیں ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں۔ 'جوئے شیر' ان کی غزلیات کا اولین مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شاعر کی شخصیت بھی نمود کرتی ہے اور اس کا عہد بھی بولتا ہوا نظر آتا ہے۔

محمد شاہد پٹھان کے یہاں اگر فنی مبادیات کی وساطت سے گفتگو کی جائے تو عروض و معانی، زبان و بیان، فنِ شعری فصاحت و بلاغت اور صرفی و نحوی خوبیوں سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ 'جوئے شیر' کی غزلوں میں راست گفتاری کم، اشاروں کنایوں، رواقی اور برجستگی کا حسن زیادہ ہے۔ اساطیر، تلمیحات کا برمحل اور خلاقانہ استعمال جابجا نظر آتا ہے۔ ان غزلوں میں عصری حسیت، تغزل کے دلکش پیرائے میں ملتی ہے۔ ان میں کلاسیک کی صالح کیفیت کو محسوس کیا جاسکتا ہے، ان کے باطن میں ایک مستقل تڑپ، کسک اور دردمندی کی زیریں لہر کی کاٹ کو محسوس کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ یہ شاعری روایت سے یکسر انحراف کرنے کے بجائے عصری فضا میں اپنے وجود کا اثبات چاہتی ہے۔ یہ شاعری نہ تو فیشن زدہ ہے، نہ فارمولہ گزیدہ، یہ تو انفرادی جذبے اور احساس کا شعری اظہار ہے۔

محمد شاہد پٹھان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ سادگی میں پرکاری کو فروغ دے رہے ہیں جسے کلاسیکل ادب میں 'سہل ممتنع' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ 'سہل ممتنع' کی راہ اپنانے میں انھوں نے گہری معنویت کے حصول کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کے یہاں موجودہ عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی تقاضوں کو غزل کے کلاسیکل پیکر میں تازہ کاری کے ساتھ سمونے کی سعی بلیغ ملتی ہے۔ یہ غزلیں ایک بیدار ذہن کے تخلیقی عمل کا فطری نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں جگہ جگہ معنی آفرینی اور نکتہ وری کا حسن جھلکتا ہے۔

ہر ادیب اپنے دور کے حاوی رجحان کے مطابق خود کو ساز گار بنا لیتا ہے اور عصری اقدار و لب و لہجے کی تشکیل کرتا ہے۔ شاہد پٹھان نے بھی عصری رجحانات اور اسالیب کو قبول کیا ہے۔ ان کی غزلیں اپنی زمین سے پوری طرح جڑی ہوئی ہیں۔ ان میں فکری ارتکاز ہے، جذباتی اور بے اعتدالی کی جگہ سنجیدگی اور تہ داری ہے، روایت کا رشتہ عصری رجحان سے استوار کرنے کی سعی ہے، کلاسیکل محاسن کی پاسداری ہے اور آج کے انسان کی نفسیاتی اور داخلی کشاکش کو تازہ کاری کے ساتھ غزل کے پیکر میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش ہے۔ یہ غزلیں ایک حساس، مضطرب اور تربیت یافتہ ذہن کی دین ہیں۔ یہ شاعری ایک ایسے شاعر کے تجربات و مشاہدات کا شعری اظہار ہے جو مثبت اقدارِ حیات پر کامل یقین رکھتا ہے۔ شاہد پٹھان اپنی غزل گوئی میں مسلسل ریاضت اور نئے لب و لہجے کی جستجو میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

'جوئے شیر' کی غزلوں میں جمالیاتی رویہ بھی ٹھوس اور واضح ہے۔ شاعر کا محبوب ماورائی نہیں بلکہ ارضی ہے، زبان و بیان کا لطف اور لہجے کا بانکپن اس پر مستزاد ہے۔ شاہد پٹھان رسمی شاعر نہیں ہیں۔ ان کے کلام میں شاعر کی باطنی شخصیت کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ انھوں نے آج کے دورِ پرآشوب کے سفاک اور سنگین حقائق مثلاً اخلاقی گراوٹ، انسانی قدروں کا زوال اور تہذیب کی پامالی وغیرہ کو موثر شعری پیرائے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ انھیں اپنے عہد کا ادراک ہے، ساتھ ہی انفس و آفاق کی روشنی کا عرفان بھی ہے۔ انھیں اپنے ماحول کا گہرا شعور ہے جس کے اظہار میں فنی نظم و ضبط ہے۔ 'جوئے شیر' کے شاعر کا لہجہ مانوس ہوتے ہوئے بھی نیا سا لگتا ہے۔

ذیل میں کسی تخصیص و تعین کے بغیر 'جوئے شیر' سے چند اشعار پیش کیے جارہے ہیں جن سے ماسبق میں معروضہ بیشتر نظریات و خیالات کی تائید و توثیق ہو جائے گی:

زمانے والے جنھیں توڑ پھوڑ دیتے ہیں
میں دل لگاتا ہوں ایسے ہی آئینوں سے

تمام شہر کو مقتل میں کردیا تبدیل
محافظوں نے بھی کیسے بچا لیے ہیں کیا کیا

ہوائے صبح سے ملتی تھی تازگی پہلے
نفس کو اب تو کدورت فضا سے ملتی ہے

کتنا بدلا ہے مرے دور کا انداز نظر
شہر کے بچوں نے ٹہنیوں کو کھلونا تھا

کتابِ حسن کی تفہیم آساں ہے کہاں اتنی
کہ کھلتے ہیں معانی سے حجاب آہستہ آہستہ

ہماری آبلہ پائی کسی دن رنگ لائے گی
کھلیں گے خارزاروں میں گلاب آہستہ آہستہ

ہوائے وقت کے سفاک ہاتھوں سے شجر ٹوٹے
کسی کا آشیاں اجڑا کسی کے بال و پر ٹوٹے

شجر پر خار اب اگنے لگے ہیں
سیاست بیج ایسے بو رہی ہے

'جوئے شیر' محمد شاہد پٹھان کے تابناک مستقبل کا غماز ہے۔ مجھے اس مجموعے کی اشاعت سے خوشی ہوئی ہے۔

☆☆☆

بقیہ: علامہ اقبال کا تصورِ تقدیر

صفحہ ۲ سے آگے

جبلتوں بلکہ تقاضے پورے کرتا ہے جس طرح حیوان کرتے ہیں تو پھر اس میں اور عام حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ ابن مسکویہ لکھتے ہیں:

"والانسان اذا نقصت افعاله وقصرت عما خلق له اعنی ان تکون افعاله التی تصدر عنه و عن رویته غیر کاملة اخری بان یحط عن مرتبة الانسانیة الی المرتبة البهیمیة هذا ان صدرت افعاله الانسانیة عنه ناقصة غیر تامة"

یعنی "جب انسان کے اعمال اس درجے سے فروتر اور کمتر واقع ہوں جس درجے کے اعمال کی خاطر اسے پیدا کیا گیا ہے، مطلب یہ کہ اگر اس سے اس کی افتادِ طبع کے باعث جو کچھ سرزد ہوتا ہے وہ کامل اور معیاری نہیں تو پھر وہ مستحق ہو جاتا ہے کہ اسے حیوان کے مرتبے پر گرا دیا جائے اور یہ فقط اس حال میں ہوگا جب اس کے انسانی افعال میں نقص اور کمی واقع ہو اور وہ ویسے نہ ہوں جیسے کہ ہونے چاہئیں"۔

ظاہر ہے کہ انسان کو یہ جوہرِ اختیار اور ملکۂ انتخاب خود خدا نے دیا ہے اور یہ عین خدا کی منشا کے مطابق ہے۔ یہی باعث ہے کہ جب انسان اس مقام کا عملاً اہل نہیں رہتا اور تمیزِ خیر و شر کر کے اپنے مقامِ آدمیت کا تحفظ نہیں کرتا تو آئینِ فطرت اسے سزا دیتا ہے اور وہ حیوان بن کر رہ جاتا ہے خواہ اس کی ظاہری شکل و صورت کتنی ہی مہذب و متمدن ہو اور اس کے نمائشی آداب کتنے ہی نفیس ہوں مگر اس کے اندر جو روح کارفرما ہوتی ہے وہ حیوانی ہوس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی.....

پھر جب آدمی حیوان بن جائے تو وہ اس شے کے شعور سے بھی محروم ہو جاتا ہے جسے آدمیت کہتے ہیں۔ آدم کے ہاتھوں 'مقامِ آدمیت' کا تحفظ حضرت علامہ کے نزدیک اثباتِ خودی ہے، اس کے برعکس نفیِ خودی۔ اگر آدمی کو ایسا بنایا جاتا کہ وہ فقط خیر ہی کا انتخاب کر سکتا اور شر اختیار کرنے کا اہل نہ ہوتا تو پھر یہ کہنا بجا ہوتا کہ وہ مجبور ہے۔ اب چوں کہ وہ اختیارِ شر اور انتخابِ خیر پر قادر ہے اور دونوں کے مابین تمیز کر سکتا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ مجبورِ محض نہیں، کچھ اس کا اپنا میدانِ عمل بھی ہے جہاں وہ آزاد ہے۔ بقول حضرت علامہ مشیتِ ایزدی نے اس کی آزادیِ عمل میں خلل نہ ڈالنے کی خاطر یہ خطرہ قبول کر لیا کہ آدمی شر بھی انتخاب کر لے۔ "لہٰذا اگر مشیتِ ایزدی یونہی تھی کہ اس طرح کا خطرہ برداشت کر لیا جائے تو اس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہو جاتی ہے کہ خدا کو اپنے بندوں پر کس قدر اعتماد ہے..... انسان کا بھی فرض ہے کہ اس اعتماد میں پورا اترے۔ یوں بھی جس ہستی کی تخلیق 'احسنِ تقویم' پر ہوئی مگر جسے 'اسفل السافلین' میں لوٹا دیا گیا، اس کی مخفی قوتوں کی تربیت کچھ یونہی ممکن تھی کہ اس طرح کا خطرہ برداشت کر لیا جائے"۔[۲۹]

تسخیرِ ارض و سما و مافیہا اور نفخِ روح والی آیات گویا استحکام و اثبات اور اقدام و ارتقا کے احکام ہیں اور یہیں سے صاحبِ ایمان آدم دیگر مخلوقاتِ عالم سے جدا ہو جاتا ہے اس لیے کہ دیگر مخلوقات احکامِ خیر و شر کی روشنی میں عمل پیرا نہیں ہوتیں۔ انھیں Choice نہیں دیا گیا۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند[۳۰]

اس شعر سے یہ بھی عیاں ہے کہ جب آدم ایمان سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ انسانیت کے مقام سے بھی ساتھ ہی محروم ہو جاتا ہے اور حیوانی سطح کی جانب لڑھک جاتا ہے بلکہ نباتات و جمادات کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

حیوان اپنی نوع سے بلند تر نہیں ہو سکتے مگر انسان کو بہترین تخلیق میسر ہے، لہٰذا وہ اخلاقی، روحانی اور وجدانی بے شمار بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ وہاں تک بھی جاسکتا ہے، جہاں فرشتوں کے پر جلیں۔ لیکن جب انسان انسانیت کا تحفظ نہیں کرسکتا تو یہ پستی کی اس حد تک جا پہنچتا ہے جہاں تک کوئی حیوان نہیں پہنچتا، اس لیے کہ حیوان کے ممکنات محدود ہیں اور انسان کے ممکنات غیر محدود۔ اگر انسان اپنی قوی تر اور کارآمد تر عقلی، فکری اور ذہنی صلاحیتوں کو بدی کا ہتھیار بنائے تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی حیوان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ کیا حیوان اپنی نوع کی اجتماعی ہلاکت کے لیے گیس چیمبرز ایجاد کرسکتا ہے؟ یا ہائیڈروجن بم بنا سکتا ہے؟

ایسی وسیع الممکنات مخلوق کو خیر و شر سے آگاہ کرنا اور پھر پابندِ آداب کرنا لازم تھا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو متوازن رکھے۔ چناں چہ وحی کی ضرورت لاحق ہوئی تا آنکہ مجموعی طور پر اولادِ آدم ایک ایسے مرحلے میں داخل ہوگئی جہاں اس کے قوائے شعور اور ملکہ ہائے فہم و فراست سن بلوغ کو پہنچ گئے۔ اس لیے اسے کامل ترین وحی اور کامل ترین اسوہ (اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) دے کر تنبیہ کر دی گئی کہ اختیار خود تمھارا ہے، مگر ایک راہ تو یہ ہے جو صراطِ مستقیم کہلاتی ہے اور یہ توحید و رسالت کی راہ ہے۔ اس کے علاوہ کئی راہیں ہیں، وہ پُرپیچ بھی ہیں اور پہنچاتی بھی خرابی و بربادی کی منزل پر ہیں۔ فیصلہ بہرحال تمھارا اپنا ہے۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: کبیر احمد جائسی کی یاد میں

صفحہ ۳ سے آگے

سے ان سے باقاعدہ تعلق کا آغاز ہوا جو اخیر تک باقی رہا۔ ان سے تقریباً ۱۷-۱۵ برس خط وکتابت رہی افسوس کہ ان کے متعدد خطوط محفوظ نہیں رہے۔ چند خطوط جو محفوظ رہ گئے ہیں، انھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے:

[۱]

علی گڑھ

۱۵/اپریل ۲۰۰۰ء

مکرمی سلام مسنون

میں یہ خط ایک علمی ضرورت سے لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس پر توجہ دیں گے۔ مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب مجھ کو الرشاد بھجواتے ہیں مگر ڈاک کی بدنظمی سے تمام شمارے مجھ تک نہیں پہونچ پاتے۔ اس سال جنوری کا شمارہ غائب ہوا، فروری کا ملا اور مارچ کا آج تک نہیں آیا۔ آئندہ کی خبر خدا جانے۔ جنوری کے شمارے سے مولانا کے مضمون کی پہلی قسط اور مارچ کے شمارے سے آپ کا مضمون پڑھنا چاہتا ہوں۔ اگر ممکن ہو سکے تو یہ دونوں شمارے کسی طرح مجھ کو بھجوا دیجئے۔

امید ہے آپ اپنے علمی کاموں میں مشغول ہوں گے۔

والسلام

مخلص

کبیر احمد جائسی

[۲]

علی گڑھ

۲۸/اپریل ۲۰۰۰ء

مکرمی سلام مسنون

آج کل بیمار ہوں اس لیے جواب میں دیر ہوئی۔ آپ کا بھیجا ہوا الرشاد کا پیکٹ [جنوری اور مارچ] ملا۔ شکریہ۔ اپریل کا آج تک نہیں ملا۔ کہاں تک شکایت کروں۔

ایک ضروری کام یہ کریں کہ مولانا مسعود علی ندوی کے انتقال پر مجیب اللہ صاحب ندوی نے ایک خاصا طویل مضمون "قومی آواز" لکھنؤ (اس وقت تک دہلی ایڈیشن کا وجود نہ تھا) میں شائع کروایا تھا۔ اس کو تلاش کر کے الرشاد میں شائع کر دیں۔ ورنہ نسل کو ان کے بارے میں کوئی بتلانے والا نہ ملے گا۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر میں نے بمبئی کے ایک ماہنامہ "زاد سفر" [نومبر ۱۹۹۹ء] میں شائع کروائی تھی، مولانا اگر اجازت دیں تو اس کو آپ بھی شائع کر دیں۔ دلچسپ تحریر ہے۔

مولانا کی خدمت میں آداب، امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔

والسلام

کبیر احمد جائسی

مولانا مسعود علی ندوی، علامہ شبلی کے شاگرد عزیز اور دارالمصنفین کے معماروں میں تھے۔ ان سے مولانا مجیب اللہ ندوی کو غایت تعلق تھا۔ ان کی شخصیت اور خدمات پر مولانا مجیب اللہ ندوی نے قومی آواز لکھنؤ میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا، تلاش بسیار کے باوجود وہ مضمون دستیاب نہ ہو سکا بلکہ اب تک اس کا سراغ نہیں ملا۔ ممکن ہے کسی اہل علم کے ذخیرے میں 'قومی آواز' کی وہ فائل محفوظ ہو تو از راہ کرم اس کی کاپی فراہم کریں۔ بڑی نوازش ہوگی۔ پروفیسر جائسی نے اپنے خط میں اسی مضمون کا ذکر کیا ہے۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: نسل پرستی اور دیگر حیوانی...

صفحہ ۸ سے آگے

تنگ تھے۔ اس سواری کو چھ افراد یعنی تین ادھر سے اور تین ادھر سے دھکیل رہے تھے۔ ایک بے سبب پیچیدگی کے تحت ہم لوگ اتر پردیش کی حدود میں داخل ہو گئے اور کوئی موزوں قطعۂ زمین تلاش کرنے لگے۔

ایک مقام پر انھی افراد کا ایک غول کھیتوں کے اندر سے نمودار ہوا جو شاید ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ وہ سب لاٹھیوں سے لیس تھے۔ تحصیل دار نے ایک زقند بھری اور ایک جھاڑی کی آڑ میں ہو گیا۔ مگر میں سیدھی کھڑی ہو گئی اور بولی کہ کل ان کے پاس بندوقیں تھیں اور میں ان پر حاوی رہی۔ آج تو صرف لاٹھیاں ہیں تحصیل دار صاحب!

تحصیل دار قدرے خجالت کے ساتھ جھاڑی کی اوٹ سے نکلا۔ پھر ایک سرکاری عامل کو دیکھتے ہی وہ لوگ رفو چکر ہو گئے۔ اور ہم تقریباً لڑھکتے ہوئے چلے۔ تبھی ہمیں ایک سرکٹی لاش نظر آئی جو ہمارے راستے میں حائل تھی۔ تحصیل دار نے ہنکارا سا بھرا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ اس لاش کو ایک جانب سرکا دیا جائے اور ہم اس کے اوپر سے گزر کر اپنا بے تکا سفر جاری رکھیں۔ مگر میں اب کچھ بھی کرنے کو آمادہ نہ تھی۔

"اس کا سر تلاش کرو اور معلوم کرو کہ یہ کون تھا۔" میری اس ہدایت پر وہ سبھی لوگ جزبز سے ہو گئے۔ میں اس اونچی سواری سے اتری اور اعلان کیا کہ جب تک اس لاش کا سر نہیں مل جاتا، اسے اس کے دھڑ کے ساتھ جوڑ نہیں دیا جاتا، تب تک میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں نے ان لوگوں سے مزید کہا کہ وہ پتہ لگائیں کہ یہ بدقسمت شخص کون تھا، نیز اس کے والدین یا خاندان کو اس بارے میں آگاہ کیا جائے۔

تھوڑی سی بحث و مشقت ہوئی اور بالآخر اس بدبخت نعش کو کچھ توقیر نصیب ہو ہی گئی۔

اس کے بعد تحصیل دار نے مجھے ایک قطعۂ زمین دکھایا جس پر پتھر ریگ رہے تھے اور ساری زمین کنکروں، پتھروں اور روڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔

اس کے بعد میں نے ایک دوسرا خط لکھا، مگر میرے خیال میں وہ کچھ کارگر ثابت نہیں ہوا۔ نیز میرا احساس یہ ہے کہ اس معاملے کو پھر دوسرا موڑ دے دیا گیا اور بات وہیں ختم ہو گئی۔

میں نے حتی الوسع کوشش کی مگر جب ہزار برس سے کارفرما عصبیت ایک طرف ہو اور معاشی طور پر بدحال طبقہ دوسری طرف تو یاد رکھنا چنداں مشکل نہیں کہ ہر مرحلے پر فتح کس کی ہوتی ہے۔

(باقی آئندہ)

***

انجمن ترقی اردو (ہند) کی نئی کتاب

اُنیسویں صدی میں ادب، تاریخ اور تہذیب

صدیق الرحمٰن قدوائی کے اعزاز میں مضامین

مرتبین: اطہر فاروقی، رضا حیدر، سرور الہدیٰ

- پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اردو کے اُن ممتاز ادیبوں میں ہیں جن کا انیسویں صدی کی تاریخ، تہذیب اور ادب پر اہم علمی کام ہے۔ ماسٹر رام چندر پر تحریر کردہ ان کی کتاب ادبی دنیا میں اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہی تمام باتوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر مرتبین نے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی 80ویں سالگرہ کے موقعے پر اُن کے اعزاز میں ایک ایسی کتاب ترتیب دی ہے جس میں 22 ادیبوں اور دانش وروں کے مضامین شامل ہیں۔
- بلاشبہ یہ کتاب انیسویں صدی میں ادب، تاریخ اور تہذیب کے سلسلے میں ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ضخامت: ۳۷۷ صفحات —— قیمت: ۳۰۰/روپے

نسل پرستی اور دیگر حیوانی خصوصیات

لیلا نائیڈو

تیسری قسط

لیلا نائیڈو کی انگریزی خودنوشت Leela Naidu: A Patchwork Life کے ایک باب سے

انگریزی سے ترجمہ: مظفر حسین سیّد
(29/11- سرسیّد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی110002)
Email: syedmh92@yahoo.com

ذات پرستی نسل پرستی کا ہی ایک روپ

نسل پرستی کے مسئلے پر دوسری اقوام کو موردِ الزام قرار دینے سے قبل ہمیں خود اپنے ضمیر کو ٹٹولنا چاہیے۔ دیکھا جائے تو ذات پرستی یا ذاتی عصبیت بھی دراصل نسل پرستی کا ہی ایک روپ ہے، بھیانک روپ۔ اس تلخ حقیقت کا براہِ راست تجربہ مجھے دہلی کے قیام کے دوران ہوا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ میری خانگی ملازمہ انگوری زار و قطار رو رہی تھی۔ میں اسے خاموشی سے دیکھتی رہی، حتیٰ کہ اس کے آنسوؤں کا سیلاب تھم گیا۔ تب میں نے اس سے اس کی پریشانی اور بے چینی کا سبب پوچھا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ وہ دریائے جمنا کے کنارے ایک جھگی بستی میں رہتی ہے، جسے ان دنوں ہریجن بستی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے "گنگا" ریلوے سے ایک قطعۂ زمین خریدا تھا، عوامی نیلامی کے ذریعے اور اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے اس نے فی الواقع اپنا تمام تر اثاثہ فروخت کر دیا تھا، یہاں تک اس نے اپنے زیورات جو بھی تھے وہ بھی رہن رکھ دیے تھے اور حد یہ کہ اپنی پالتو بکریاں بھی بیچ دی تھیں۔ اور یہ زبردست قربانی اس لیے تھی کہ پیٹ پالنے کو زمین کا ایک ٹکڑا مل رہا تھا۔ وہ بے وقعت زمین بھی ان کے ہاتھ یوں لگ گئی تھی کہ اسے خریدنے کے لیے کسی اور خریدار نے بولی لگائی ہی نہیں تھی کیوں کہ لوگوں کی نظر میں وہ زمین ادھر تھی یعنی بنجر اور ناقابلِ کاشت۔ پھر برسوں کی محنتِ شاقہ کے بعد ان لوگوں نے کنکر، پتھر اور روڑیاں صاف کر کے اس زمین کو ہموار کر لیا تھا اور نتیجتاً وہ بنجر زمین اس لائق ہو گئی تھی کہ اس میں باجرے کی فصل اگائی جا سکتی تھی۔ اب انھیں یہ امید ہو گئی تھی کہ وہ کھیتی کر کے اپنے غریب کنبے کی گزر بسر کا سامان کر سکیں گے۔ لیکن جیسے ہی زمین قابلِ کاشت ہوئی، ایک گروہ سامنے آ گیا، جس کے پاس نہ صرف ٹریکٹر تھے بلکہ بھینسیں بھی تھیں۔ ان کا طریقۂ کار یہ تھا کہ وہ پہلے بھینسوں کو کھیت میں کھلا چھوڑ دیتے تھے، جو نئے پودوں کو چر لیتی تھیں۔ اس کے بعد باقی ماندہ خس و خاشاک کو ان کے ٹریکٹر روند کر نابود کر دیتے تھے۔ اس گروہ کا مقامی پولیس کے ساتھ ساز باز تھا اور جب بھی انگوری اور اس جیسے دیگر دلت احتجاج کرتے تو فوراً پولیس حرکت میں آ جاتی تھی۔ وہ ان کے مردوں کو گرفتار کر کے دنوں کے لیے سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیتے تھے اور عورتوں کو چھ دن کے لیے حوالات میں بند کر دیا جاتا تھا۔ الزام تراشی کے لیے ان غریبوں کے ہنسیا جیسے زرعی اوزاروں کو اسلحہ کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کارروائی سے نہ صرف ان کی محنت کا ثمرہ ضائع ہو جاتا تھا، بلکہ ان کے باہر آنے تک ان کے کھیت بھی لوٹے کھسوٹے جا چکے ہوتے تھے۔

"مجھے بتاؤ کہ وہ لوگ اب کب آئیں گے؟" میں نے انگوری سے پوچھا۔

تاہم کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے میں صورتِ حال کو پوری طرح سمجھ لینا چاہتی تھی، اس لیے میں نے اپنے ایک سیاست داں دوست جگ پرویش چندر سے رابطہ قائم کیا۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھے، جو دہلی اور اس کے مختلف فرقوں اور طبقوں کے بارے میں خاصے باخبر تھے، جب کہ باقی لوگ یہ سب کب کا فراموش کر چکے تھے۔

جگ پرویش نے میری بات سن کر کہا: "یہ لوگ ضرور اعلیٰ ذات کے ہوں گے۔ کیوں کہ ایسے امور کا محور ذات پات کی عصبیت ہی ہوا کرتی ہے۔"

ایک شام انگوری نے مجھے باخبر کیا کہ ان لوگوں نے رات کے اندھیرے میں آنے کی دھمکی دی ہے۔

"میں وہاں تک کیسے پہنچ سکتی ہوں؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

میری بات سن کر وہ ایک دم خوف زدہ ہو گئی اور بولی: "نہیں، بی بی جی، آپ وہاں مت آیئے گا۔ ان کے پاس بندوقیں ہوتی ہیں۔ آپ ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

میں نے اس کی باتوں کو مبالغے پر محمول کیا، لہٰذا میں نے ایک ٹیکسی کرایے پر حاصل کی اور روانہ ہو گئی۔ میں نے کوئی تین میل پار کیے، اس کے بعد انگوری نے کہا کہ "اس سے آگے کوئی راستہ نہیں ہے۔ آپ کو اوبڑ کھابڑ زمین پر ہی چلنا پڑے گا۔ اس میں آپ پھسل بھی سکتی ہیں اور گر بھی سکتی ہیں۔"

پھر میں نے خود محسوس کیا کہ انگوری کا بیان درست تھا۔ میں پل کے اوپر سے ہی چار ٹریکٹروں کو دیکھ سکتی تھی۔ میں نے ٹیکسی والے سے اس جگہ ٹھہرنے کو کہا اور ڈھلان پر اترنے لگی۔

"تم لوگ کون ہو؟" میں نے گرج کر ان لوگوں سے پوچھا۔

میں ٹریکٹروں کی روشنی سے پرے چند لڑاکو قسم کے لوگوں کو بہ خوبی دیکھ سکتی تھی، لیکن میری بات سن کر وہ سب حیران ہو گئے۔ جب میری آنکھیں اس نیم روشن ماحول میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے مشاہدہ کیا کہ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ بہر کیف مجھے یاد نہیں کہ میرے اوپر کسی قسم کا خوف طاری ہوا ہو۔ البتہ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں اس وقت بہت طیش میں تھی۔

"یہ زمین تمھاری نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اسے سرکار سے خریدا ہے اور کڑی محنت کے بعد اسے ہموار کر کے کاشت کے قابل بنایا ہے۔"

میرے اس اعلان سے ان لوگوں پر حیرت و استعجاب کا حملہ ہوا تو مگر بہت شدید نہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کچھ بااثر لوگوں کا حوالہ دینا بھی ضروری تھا۔ پھر میں نے اپنا مہارانی والا لبادہ اوڑھا اور زور دار آواز میں کہا: "میں نہ صرف ریلوے کے تحصیل دار کو اس معاملے کی پوری جانکاری دوں گی، بلکہ اس سلسلے میں مسز اندرا گاندھی سے بھی ملوں گی، جن کے ساتھ میری گہری دوستی ہے۔"

جب ٹریکٹر واپس جانے لگے تو میں نے پل پر ایک اور کار کے رکنے کی آہٹ سنی۔

"لیلا" یہ ڈوم کی آواز تھی: "کیا یہ تم ہی ہو؟"

"ہاں، میں یہاں نشیب میں ہوں۔" میں نے بلند آواز میں جواب دیا۔

ڈوم ٹیکسی ڈرائیور کی مدد سے ڈھلان پر پھسلا اور بُرا بھلا کہتا، کوستا ہوا نیچے آ گیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

میں نے وہاں اپنی موجودگی کے جواز کی صراحت کی۔ تاہم اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے، جیسے اسے جواب نہ ملا ہو۔

اگلے روز میں نے مسز اندرا گاندھی کو ایک طویل خط لکھا۔ مسز گاندھی کے اندر چاہے جو خامیاں رہی ہوں، لیکن یہ طے ہے کہ وہ کوئی فیصلہ کرنے میں سستی ہرگز نہیں کرتی تھیں۔ دوسرے ہی دن مجھے وزیرِ اعظم کے دفتر سے باضابطہ اطلاع دی گئی کہ مجھے ریلوے کے تحصیل دار کے ساتھ موقع پر جانا تھا اور مذکورہ قطعۂ زمین کی نشاندہی کر کے اس معاملے کو از سرِ نو طے کرانا تھا۔ اور پھر میں یعنی لیلا نائیڈو، اور تحصیل دار زمین سے متعلق دستاویز لے کر ایک خاص قسم کی سماتاتی دھکیل نما سواری میں بیٹھ کر موقع پر پہنچے۔ وہ گاڑی کیا تھی، ایک پہیے اور دو ٹانگوں پر نصب ایک تپائی بلکہ چارپائی تھی جس پر بیک وقت چار افراد بیٹھ سکتے تھے۔ البتہ اس پر ایک تختی نشست بھی تھی اور اس کے بازو ہینڈلوں کی شکل میں آگے سے پیچھے

(بقیہ صفحہ ۔ پر)

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ـــ (ادارہ)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۰ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org